Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

The Scholarly Methodology of Islamic Preaching: From the Prophetic Era to the Contemporary Age

اسلامی خطابت کا علمی منہج: عہدِ نبوی ﷺ سے عصرِ حاضر تک

Naimat Ullah Khan
PhD Scholar, The Islamia University of Bahawalpur
Email: naimatmphil@gmail.com
ORCID: https://orcid.org/0009-0008-9631-7681

Dr. Muhammad Usman Khalid
Lecturer, Edwardes College Peshawar
Email: drmuhammadusmankhalid007@gmail.com

Dr. Haseeba Mumtaz
Department of Islamic and Arabic Studies, University of Swabi
Email: emaan02020@gmail.com

Abstract

This study examines the role of preachers and imams in Islamic history with particular focus on their methodology of deriving evidence from narrations (riwāyāt) and the resulting impact on Muslim society. From the Prophetic era to the period of the Tābiʿūn and beyond, religious discourse has played a central role in shaping moral consciousness, legal understanding, and collective identity. While early Islamic scholarship established rigorous principles for verifying and interpreting narrations—such as scrutiny of chains of transmission (isnād), textual analysis, and alignment with the broader objectives of Sharīʿah—historical developments reveal instances where these standards were not consistently upheld in public preaching. The study analyzes both the foundational methodological principles of hadith-based argumentation and the deviations that emerged due to political motives, popular expectations, emotional storytelling, and the circulation of weak or fabricated narrations. Through selected historical case studies, the research demonstrates how uncritical use of narrations influenced public perception, doctrinal formation, and social attitudes. It further argues that the misuse of narrations not only undermines scholarly integrity but also distorts religious consciousness at a collective level. In light of contemporary challenges—particularly the rapid dissemination of religious content through digital media—the paper emphasizes the urgent need to revive methodological rigor, ethical responsibility, and critical awareness in religious preaching. The study concludes that the reform of religious discourse is inseparable from the reform

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

of methodological engagement with narrations, and that restoring scholarly discipline in public preaching is essential for preserving theological balance and social harmony.

Keywords:
Islamic Preaching, Imams and Khateebs, Hadith Methodology, Narration Criticism, Fabricated Traditions, Religious Discourse, Social Impact, Islamic Intellectual History

تمہید

انسانی معاشروں کی فکری اور اخلاقی تشکیل میں زبان اور بیان کو ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بیان کی: ﴿الرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ " — رحمٰن نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اور اسے بیان کرنا سکھایا۔"[1] یہ "بیان" ہی ہے جو انسان کو محض حیاتیاتی وجود سے بلند کر کے فکری، تہذیبی اور معاشرتی وجود میں تبدیل کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں خطباء اور ائمہ نے اسی قوتِ بیان کو دعوت، اصلاح اور تربیت کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ نبی کریم ﷺ نے خود خطابت کو دعوتِ دین کا بنیادی وسیلہ قرار دیا اور فرمایا: «إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا" — «بے شک بعض بیان میں سحر کی تاثیر ہوتی ہے۔"[2] اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان میں اثر انگیزی کی قوت موجود ہے، لیکن یہی قوت اگر ذمہ داری کے ساتھ استعمال نہ ہو تو گمراہی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

اسلامی روایت میں خطابت محض تقریر یا خطیبانہ مہارت کا نام نہیں بلکہ ایک دینی امانت ہے۔ جمعہ کے خطبات، عیدین کے اجتماعات اور مختلف دینی مجالس کے بیانات نے صدیوں تک مسلم معاشرے کی فکری سمت متعین کی ہے۔ قرآن مجید نے دعوت و تبلیغ کا اصول یوں واضح فرمایا: ﴿ادْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ " — اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو۔"[3] اس آیت میں "حکمت" اور "موعظۂ حسنہ" کو باہم لازم قرار دیا گیا ہے۔ حکمت کا تقاضا تحقیق، فہم، توازن اور سیاق و سباق کا شعور ہے، جبکہ موعظۂ حسنہ اخلاص، خیر خواہی اور نرم اسلوب کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب خطیب ان دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر دیتا ہے تو یا تو خشک اور بے روح علمی گفتگو سامنے آتی ہے، یا پھر جذباتی اور غیر مستند بیانیہ جو وقتی اثر تو پیدا کرتا ہے مگر پائیدار اصلاح کا ذریعہ نہیں بنتا۔

اسلامی علمی روایت میں محدثین نے روایت کی صحت کے لیے جو غیر معمولی احتیاط برتی، وہ دراصل اسی امانت کی حفاظت تھی۔ نبی کریم ﷺ نے جھوٹی نسبت کے بارے میں سخت وعید سناتے ہوئے فرمایا: «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" — «جو شخص جان بوجھ کر میری طرف

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

جھوٹ منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"[4] اس تنبیہ سے واضح ہوتا ہے کہ روایت میں بے احتیاطی محض علمی کمزوری نہیں بلکہ ایک سنگین اخلاقی جرم ہے۔ اس کے باوجود تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسے واقعات سامنے آئے جہاں بعض خطباء نے تحقیق کے بغیر روایات بیان کیں یا ضعیف و موضوع احادیث کو جذباتی اثر کے لیے استعمال کیا۔ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے منسوب جھوٹی روایت کا واقعہ اس رویّے کی ایک نمایاں مثال ہے،[5] جبکہ امام اعمش اور امام شعبی سے متعلق واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بعض واعظین نے علمی احتیاط کو نظر انداز کیا، جس سے علمی اور اخلاقی بحران نے جنم لیا۔[6]

یہ مسئلہ صرف ماضی تک محدود نہیں رہا۔ عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا کے پھیلاؤ نے خطابت کے اثر کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اب ایک غیر مستند روایت یا بے تحقیق قول چند منٹوں میں لاکھوں افراد تک پہنچ سکتا ہے، اور یوں دینی شعور پر اس کے اثرات بھی وسیع ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں خطیب کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس پس منظر میں یہ مقالہ اس بنیادی سوال کا جائزہ لیتا ہے کہ تاریخ میں خطباء اور ائمہ نے روایات سے استدلال کا کون سا منہج اختیار کیا، کن مواقع پر انحراف پیدا ہوا، اور اس کا اسلامی معاشرے کی فکری تشکیل پر کیا اثر پڑا۔ اس تحقیق کا مقصد محض تنقید نہیں بلکہ ایک اصولی اور اصلاحی خاکہ پیش کرنا ہے، تاکہ خطابت کو اس کی اصل علمی اور اخلاقی بنیادوں پر استوار کیا جا سکے اور بیان کی قوت کو دین کی صحیح ترجمانی کا ذریعہ بنایا جا سکے۔

اسلامی تاریخ میں خطابت کا ارتقا (عہد نبوی ﷺ سے تابعین تک)

اسلامی تاریخ میں خطابت کا ارتقا محض ادبی یا سماجی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ یہ دراصل وحی، دعوت اور معاشرتی تشکیل کے ساتھ جڑا ہوا ایک منظم عمل ہے۔ اگر اس ارتقائی سفر کو سمجھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ خطابت ابتدا میں محض ترغیب و ترہیب کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ ایک علمی، اخلاقی اور عملی تحریک کا ستون تھی۔

1۔ عہد نبوی ﷺ میں خطابت کا منہج

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا بنیادی ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت اور اس کی تشریح تھی۔ خطبہ جمعہ، خطبہ عید، خطبۂ حجۃ الوداع، اور مختلف مواقع پر ارشادات اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ ﷺ کی خطابت چند نمایاں خصوصیات کی حامل تھی:

1. اختصار اور جامعیت
2. نصوص پر مبنی استدلال
3. عملی تربیت
4. جذبات اور عقل کے درمیان توازن

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

"كَانَتْ صَلَاةُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَصْدًا وَخُطْبَتُهُ قَصْدًا"[1]

"رسول اللہ ﷺ کی نماز بھی معتدل ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی معتدل ہوتا تھا۔"

یہ اعتدال دراصل اس اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خطابت کا مقصد سامعین کو متاثر کرنا نہیں بلکہ ان کی اصلاح کرنا ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع اس ارتقائی مرحلے کی اعلیٰ مثال ہے، جہاں آپ ﷺ نے انسانی حقوق، عدل، امانت، خواتین کے حقوق اور سود کی حرمت جیسے اصولی مسائل کو واضح اور منظم انداز میں بیان فرمایا۔[2] یہاں خطابت محض مذہبی موعظہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی دستور کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

2۔ عہد صحابہ میں خطابت: ذمہ داری اور احتیاط

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد خطابت کا منصب صحابہ کرامؓ کے سپرد ہوا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا پہلا خطبہ خلافت اسلامی سیاسی خطابت کا بنیادی نمونہ ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللَّهَ فِيكُمْ، فَإِنْ عَصَيْتُهُ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيْكُمْ"[3]

"جب تک میں تمہارے درمیان اللہ کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو، اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت لازم نہیں۔"

یہ جملہ اسلامی سیاسی شعور کی بنیاد رکھتا ہے۔ یہاں خطابت اقتدار کا اظہار نہیں بلکہ احتساب کی دعوت بن جاتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے خطبات میں عدل، محاسبہ اور نصیحت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے خطبات میں قرآن و سنت کی صراحت کے ساتھ عملی مسائل کا حل بھی شامل ہوتا تھا۔[4]

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ روایت بیان کرنے میں شدید احتیاط برتتے تھے۔ حضرت ابن سیرین فرماتے ہیں:

"لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الإِسْنَادِ، فَلَمَّا وَقَعَتِ الفِتْنَةُ قَالُوا سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ"[5]

"ابتدا میں لوگ سند کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے، لیکن جب فتنہ برپا ہوا تو انہوں نے کہا: ہمیں اپنے راویوں کے نام بتاؤ۔"

یہ قول دراصل اس مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے جہاں خطابت اور روایت کے میدان میں تحقیق کا باقاعدہ شعور پیدا ہوا۔

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

3۔عہد تابعین میں علمی منہج کی تشکیل

تابعین کے دور میں اسلامی سلطنت وسیع ہو چکی تھی اور مختلف فکری وسیاسی گروہ سامنے آ رہے تھے۔اس دور میں خطابت نے ایک نیا مرحلہ طے کیا:

- فقہی مباحث کا اضافہ
- سیاسی اختلافات
- موضوع روایات کا آغاز
- قصہ گوئی (قصاص) کا فروغ

امام ابن الجوزی نے "القصاص والمذکرین" میں ان واعظین پر تنقید کی ہے جو عوام کو متاثر کرنے کے لیے غیر مستند روایات بیان کرتے تھے۔[6]

اسی دور میں محدثین نے باقاعدہ علمِ جرح وتعدیل کی بنیاد رکھی۔امام شعبی،امام اعمش،اور حسن بصری جیسے بزرگوں نے روایت کی صحت پر زور دیا اور عوامی خطابت میں مبالغہ آمیزی سے احتراز کی تلقین کی۔[7]

تابعین کے دور میں دو رجحانات واضح نظر آتے ہیں:

1. علمی اور نصوص پر مبنی خطابت
2. جذباتی اور قصہ گو خطابت

یہی تقسیم بعد کے ادوار میں مزید واضح ہو گئی۔

4۔ارتقائی نتیجہ

عہد نبوی ﷺ سے تابعین تک خطابت کا ارتقا تین بنیادی مراحل سے گزرا:

1. وحی پر مبنی اصلاحی خطابت
2. خلافتی ذمہ داری اور احتسابی خطابت
3. علمی تنقید اور سند کی تحقیق کا آغاز

یہ دور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اسلامی خطابت کی اصل روح تحقیق،احتیاط اور نصوص سے وابستگی تھی۔جب تک یہ اصول برقرار رہے،خطابت معاشرتی تعمیر کا ذریعہ بنی؛اور جب ان اصولوں میں کمزوری آئی تو انحراف کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

روایات سے استدلال کا منہج: اصول اور انحراف

اسلامی علمی روایت میں حدیث اور آثارِ سلف کو استدلال کی بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی صحت اور درایت کی جانچ کو بھی دین کا حصہ سمجھا گیا۔ قرآن مجید نے واضح طور پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو دین کا لازمی جز قرار دیا: ﴿**وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا**﴾ "—رسول تمہیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ"۔[8] اس آیت کی رو سے سنت سے استدلال دینی ذمہ داری ہے، لیکن اسی کے ساتھ روایت کی صحت کی تحقیق بھی لازم ہے، کیونکہ اگر نسبت ہی غیر ثابت ہو تو اطاعت کا تقاضا اپنی اصل کھو دیتا ہے۔ اسی تناظر میں محدثین نے سند کے نظام کو دین کی حفاظت کا حصار قرار دیا۔ امام عبداللہ بن مبارک کا یہ مشہور قول اسی شعور کی عکاسی کرتا ہے کہ "الإسناد من الدين، ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء" —یعنی سند دین کا حصہ ہے، اور اگر سند نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی بات کو دین کہہ کر پیش کر دیتا۔[9] یہ اصول دراصل خطابت کے لیے بھی بنیادی رہنما ہے، کیونکہ جب خطیب منبر پر روایت بیان کرتا ہے تو وہ اسے محض ایک تاریخی حکایت کے طور پر نہیں بلکہ دینی حجت کے طور پر پیش کر رہا ہوتا ہے۔

تابعین کے دور میں جب فتنوں اور سیاسی اختلافات کا آغاز ہوا تو روایت کی چھان بین کو مزید منظم کیا گیا۔ ابن سیرین کا قول اس مرحلے کی علمی بیداری کو ظاہر کرتا ہے کہ پہلے لوگ سند کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے، لیکن جب فتنہ برپا ہوا تو کہا جانے لگا: "سمّوا لنا رجالكم" —اپنے راویوں کے نام بتاؤ۔[10] اس سے واضح ہوتا ہے کہ روایت کا منہج ایک تدریجی ارتقا سے گزرا اور تحقیق و تنقید کو دینی ذمہ داری سمجھا گیا۔ امام شافعی نے اپنی تصنیف الرسالۃ میں اس امر پر زور دیا کہ حدیث کو قرآن کے مخالف سمجھنے کے بجائے اس کے صحیح فہم کے ساتھ جمع کیا جائے، اور کسی بھی روایت کو قبول کرنے سے قبل اس کی صحت اور مفہوم کا جائزہ لیا جائے۔[11] اس اصولی موقف نے استدلال کو ایک منظم علمی ڈھانچے میں تبدیل کیا، جس میں نصوص کے باہمی ربط اور مقاصدِ شریعت کا لحاظ بنیادی شرط قرار پایا۔

اس کے باوجود تاریخ کے مختلف ادوار میں روایات کے استعمال میں انحرافات بھی پیدا ہوئے۔ خاص طور پر قصہ گو واعظین (قصاص) کے ہاں جذباتی تاثیر کو علمی تحقیق پر فوقیت دی جانے لگی۔ امام ابن الجوزی نے اپنی کتاب القصاص والمذکّرین میں اس رجحان پر سخت تنقید کرتے ہوئے بیان کیا کہ بعض واعظین عوام کو متاثر کرنے کے لیے ایسی روایات نقل کرتے تھے جن کی کوئی مستند بنیاد نہ ہوتی تھی۔[12] ان کا مقصد اصلاح کے بجائے سامعین کو متاثر کرنا یا گریہ وزاری پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اس طرزِ خطابت نے عوامی ذہن میں دین کی ایک جذباتی اور غیر متوازن تصویر کو فروغ دیا، جس میں تحقیق اور فہم کی جگہ تاثیر اور مبالغہ نے لے لی۔ سیاسی عوامل بھی روایت کے انحراف کا ایک اہم سبب بنے۔ بعض ادوار میں حکمران طبقات یا سیاسی گروہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے روایات وضع کروائیں یا کمزور روایات کو

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

فروغ دیا۔[13] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت کا غلط استعمال محض علمی کمزوری کا نتیجہ نہیں بلکہ کبھی کبھار اقتدار اور مفاد کی سیاست سے بھی جڑا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں محدثین اور ناقدینِ حدیث نے جرح وتعدیل کا منظم نظام قائم کیا تاکہ دین کو انسانی خواہشات کا تابع بننے سے بچایا جاسکے۔

نبی کریم ﷺ کی یہ سخت وعید کہ "من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار"—جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے—اس مسئلے کی سنگینی کو واضح کرتی ہے۔[14] یہ حدیث اس امر کا اعلان ہے کہ روایت میں بے احتیاطی یا دانستہ تحریف محض علمی خطا نہیں بلکہ ایک اخلاقی جرم ہے۔ امام نووی نے بھی اس بات پر زور دیا کہ اگر کوئی ضعیف حدیث بیان کی جائے تو اس کی کمزوری کو واضح کرنا ضروری ہے، ورنہ سامعین اسے صحیح سمجھ کر قبول کر لیں گے۔[15] اس اصول کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض معاشرتی تصورات اور رسوم و روایات دینی رنگ میں رائج ہو گئیں، حالانکہ ان کی بنیاد کمزور یا غیر ثابت روایات پر تھی۔ ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روایات سے استدلال کا صحیح منہج تین بنیادی ستونوں پر قائم ہے: سند کی تحقیق، متن کی درایت، اور مقاصدِ شریعت کا لحاظ۔ جب خطیب ان اصولوں کو ملحوظ رکھتا ہے تو اس کی خطابت علمی وقار اور اخلاقی وزن حاصل کرتی ہے؛ اور جب وہ انہیں نظر انداز کرتا ہے تو دین کی تصویر مسخ ہونے لگتی ہے۔ اس لیے اسلامی خطابت کی بقا اور صحت کا انحصار اسی اصولی توازن پر ہے۔

موضوع روایات اور تاریخی مثالیں

روایات سے استدلال کے منہج میں سب سے بڑا خطرہ موضوع (من گھڑت) روایات کا داخل ہو جانا ہے، کیونکہ جب ایک جھوٹی نسبت دین کے نام پر قبول کر لی جاتی ہے تو وہ محض ایک تاریخی خطا نہیں رہتی بلکہ اعتقاد، عبادت اور معاشرتی رویّوں کو متاثر کرنے لگتی ہے۔ محدثین نے اس خطرے کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا، اسی لیے علمِ جرح وتعدیل، اسماء الرجال اور علل حدیث جیسے دقیق علوم وجود میں آئے۔ امام ابن الصلاح نے واضح کیا کہ موضوع حدیث وہ ہے جسے کسی راوی نے جان بوجھ کر گھڑا ہو اور اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہو۔[16] اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ موضوع روایت علمی کمزوری نہیں بلکہ شعوری تحریف کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تاریخی طور پر موضوع روایات کے فروغ کے متعدد اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک اہم سبب مذہبی جذبات کو ابھارنے کے لیے مبالغہ آمیز قصے بیان کرنا تھا۔ بعض قصاص عوام کو رُلانے اور متاثر کرنے کے لیے ایسے واقعات نقل کرتے تھے جن کی کوئی مستند بنیاد نہ ہوتی تھی۔ امام ابن الجوزی نے اپنی تصنیف الموضوعات میں متعدد ایسی روایات کو جمع کر کے ان کی تردید کی، جو عوامی مجالس میں بکثرت بیان کی جاتی تھیں۔[17] ان کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ ہر وہ بات جو دل کو

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

چھولے، ضروری نہیں کہ وہ دین کا حصہ بھی ہو۔اس تنبیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی ذمہ داری اور عوامی تاثیر کے درمیان توازن قائم رکھنا خطیب کے لیے کتنا ضروری ہے۔

ایک نمایاں تاریخی مثال وہ واقعہ ہے جس میں بعض افراد نے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جیسے ائمہ حدیث کے نام سے جھوٹی روایت بیان کر کے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔روایت کے مطابق جب امام احمد کو معلوم ہوا کہ ان کے نام سے غیر ثابت روایت بیان کی جارہی ہے تو انہوں نے اس پر شدید برہمی کا اظہار کیا اور اسے جھوٹ قرار دیا۔[18] یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ محدثین اپنے نام کے ساتھ بھی غیر ثابت روایت کی نسبت کو برداشت نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایک جھوٹا قول آنے والی نسلوں کے اعتقادی نظام کو متاثر کر سکتا ہے۔ اسی طرح بعض سیاسی ادوار میں حکمرانوں کی فضیلت یا مخالفین کی مذمت میں روایات گھڑی گئیں۔ابن الجوزی اور دیگر ناقدین نے ان روایات کی نشاندہی کی اور واضح کیا کہ دین کو سیاسی مفادات کا ذریعہ بنانا بدترین علمی خیانت ہے۔[19] اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ روایت کا میدان ہمیشہ غیر جانب دار نہیں رہا بلکہ اس میں انسانی خواہشات اور گروہی تعصبات بھی در آئے۔ چنانچہ علمائے حدیث نے روایت کی قبولیت کے لیے عدالت، ضبط اور اتصالِ سند جیسی شرائط مقرر کیں تاکہ دین انسانی خواہشات سے محفوظ رہے۔

ایک اور اہم مثال فضائلِ اعمال کے باب میں پائی جاتی ہے۔ بعض واعظین نے عبادات کی ترغیب کے لیے ایسی روایات بیان کیں جن کی سند نہایت کمزور تھی یا جو موضوع تھیں۔امام نووی نے اگرچہ ضعیف حدیث کو فضائلِ اعمال میں بعض شرائط کے ساتھ نقل کرنے کی اجازت دی، لیکن انہوں نے بھی یہ شرط عائد کی کہ وہ روایت شدید الضعف نہ ہو اور اسے قطعی حکم کے طور پر پیش نہ کیا جائے۔[20] عملی طور پر یہ احتیاط ہمیشہ ملحوظ نہ رہی، جس کے نتیجے میں بعض رسوم اور عقائد عوام میں دین کا حصہ سمجھ کر رائج ہو گئے۔ موضوع روایات کے اثرات محض علمی دائرے تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ معاشرتی نفسیات کو بھی متاثر کرتے ہیں۔جب ایک غیر مستند روایت بار بار منبر سے بیان کی جائے تو وہ عوامی شعور کا حصہ بن جاتی ہے، اور پھر اس کی تصحیح کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ امام ذہبی نے راویوں کی سوانح میں ان افراد کی نشان دہی کی جو قصہ گوئی کے شوق میں غیر ثابت روایات بیان کرتے تھے، تاکہ آنے والی نسلیں ان سے ہوشیار رہیں۔[21] ان تمام تاریخی مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موضوع روایات کا مسئلہ محض ماضی کا واقعہ نہیں بلکہ ایک مستقل چیلنج ہے۔جب تک خطیب روایت کی صحت، اس کے مصادر اور اس کے فہم کا جائزہ نہیں لے گا، وہ انجانے میں دین کی ایسی تصویر پیش کر سکتا ہے جو اصل نصوص سے ہم آہنگ نہ ہو۔اس لیے خطابت کی اصلاح دراصل روایت کے منہج کی اصلاح سے وابستہ ہے۔

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

عصر حاضر میں خطابت کا بحران اور اصلاحی لائحۂ عمل

عصر حاضر میں خطابت کا دائرہ تاریخ کے کسی بھی سابقہ دور کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہو چکا ہے۔ پہلے منبر کی آواز مسجد کی چار دیواری تک محدود ہوتی تھی، مگر اب الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے ایک تقریر چند منٹوں میں لاکھوں افراد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس وسعت نے جہاں دعوت اور اصلاح کے امکانات کو بڑھایا ہے، وہیں غیر مستند روایات، جذباتی بیانیے اور غیر تحقیقی خطابت کے اثرات کو بھی کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کے اس تناظر میں روایت کی تحقیق اور علمی دیانت کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ سنگین ہو گئی ہے۔[22] موجودہ دور کے بحران کا ایک پہلو یہ ہے کہ خطابت اکثر علمی تربیت سے زیادہ خطیبانہ صلاحیت کا نتیجہ بن گئی ہے۔ بعض خطباء سامعین کی تعداد اور مقبولیت کو اصل معیار سمجھتے ہیں، جس کے نتیجے میں جذباتی واقعات، کراماتی حکایات اور غیر مستند روایات کو بطور اثر انگیزی استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید دعوت کے لیے "حکمت" کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے: ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾۔[23] حکمت کا تقاضا تحقیق، فہم اور توازن ہے، جبکہ محض جذباتی ابھار وقتی اثر تو پیدا کر سکتا ہے مگر پائیدار شعور نہیں دیتا۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ جدید دور میں معلومات کی فراوانی نے تصدیق کے بغیر نقل کرنے کے رجحان کو بڑھا دیا ہے۔ سوشل میڈیا پر گردش کرنے والی روایات اور اقوال اکثر بغیر سند یا ماخذ کے منبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کے خلاف واضح ہدایت دی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ "—اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو"۔[24] یہ آیت عمومی اصول بیان کرتی ہے کہ خبر کی تصدیق کے بغیر اسے قبول کرنا درست نہیں۔ اگر عام خبریں تحقیق کی محتاج ہیں تو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب روایات بدرجہ اولیٰ تحقیق کی متقاضی ہوں گی۔ عصر حاضر میں خطابت کے بحران کا ایک پہلو فرقہ وارانہ اور سیاسی تقسیم بھی ہے۔ بعض خطباء مخصوص مسلکی یا سیاسی بیانیے کو تقویت دینے کے لیے ایسی روایات کا انتخاب کرتے ہیں جو جذبات کو بھڑکائیں، چاہے وہ کمزور یا سیاق و سباق سے ہٹی ہوئی ہوں۔ اس طرزِ عمل سے معاشرتی ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے اور دین کو اتحاد کے بجائے اختلاف کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ علمی روایت کا تقاضا یہ ہے کہ نصوص کو مجموعی تناظر میں دیکھا جائے اور مقاصدِ شریعت کو پیشِ نظر رکھا جائے، نہ کہ جزوی اقتباسات کے ذریعے عمومی حکم اخذ کیا جائے۔[25]

ان مسائل کے پیشِ نظر اصلاحی لائحۂ عمل چند بنیادی نکات پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اول، خطیب کی علمی تربیت کو منظم کیا جائے اور اصولِ حدیث، اصولِ تفسیر اور مقاصدِ شریعت کی بنیادی تعلیم کو خطابت کی اہلیت کا لازمی حصہ بنایا جائے۔ دوم، ہر روایت بیان کرتے وقت اس کا ماخذ ذکر کیا جائے اور اگر روایت ضعیف ہو تو اس

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

کی نوعیت واضح کی جائے۔ یہ وہ احتیاط ہے جس کی طرف امام نووی اور دیگر ائمہ نے توجہ دلائی ہے۔[26] سوم، خطابت کو جذباتی ابھار کے بجائے فکری تربیت کا ذریعہ بنایا جائے، تاکہ سامعین محض وقتی اثر کے بجائے علمی شعور حاصل کریں۔ چہارم، ڈیجیٹل ذرائع کے استعمال میں ذمہ داری اور تحقیق کو لازم قرار دیا جائے، اور منبر کو غیر مصدقہ مواد کی ترویج کا ذریعہ نہ بننے دیا جائے۔ عصر حاضر میں خطابت کا بحران دراصل علمی معیار کے زوال اور تصدیق کے عمل میں کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اگر روایت کے منہج، تحقیق کی روایت اور اخلاقی ذمہ داری کو دوبارہ زندہ کیا جائے تو خطابت ایک بار پھر معاشرتی اصلاح، فکری توازن اور دینی شعور کا مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔ اصلاح کا آغاز فردِ خطیب کی علمی دیانت سے ہوگا، اور یہی وہ نکتہ ہے جو اس پوری تحقیق کے مرکزی استدلال کو تقویت دیتا ہے۔

خلاصہ

اس تحقیقی مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی خطابت اپنی اصل میں محض تقریر یا خطیبانہ فن نہیں بلکہ ایک دینی امانت اور علمی ذمہ داری ہے۔ عہد نبوی ﷺ سے لے کر تابعین کے دور تک خطابت کا منہج وحی، تحقیق اور احتیاط پر قائم تھا۔ نبی کریم ﷺ کی خطابت میں اختصار، جامعیت اور نصوص پر مبنی استدلال نمایاں تھا، جبکہ صحابہ کرامؓ نے اسے احتساب، عدل اور ذمہ داری کے شعور سے جوڑا۔ تابعین کے دور میں روایت کی جانچ اور سند کی تحقیق کو باقاعدہ علمی اصول کی صورت دی گئی، تاکہ دین کو انسانی خواہشات اور سیاسی مفادات سے محفوظ رکھا جا سکے۔[27] لیکن تاریخ کے مختلف مراحل میں جب تحقیق کا عنصر کمزور ہوا تو خطابت میں انحرافات پیدا ہوئے۔ قصاص کی جذباتی خطابت، سیاسی مقاصد کے لیے روایات کا استعمال، اور عوامی ذوق کے مطابق مبالغہ آمیز واقعات کی ترویج نے روایت کے منہج کو متاثر کیا۔ موضوع اور ضعیف روایات کے فروغ نے نہ صرف دینی فہم میں ابہام پیدا کیا بلکہ بعض اوقات ایسے اعتقادی اور عملی رجحانات کو بھی جنم دیا جو اصل نصوص سے ہم آہنگ نہ تھے۔ محدثین اور ناقدین نے ان انحرافات کی نشاندہی کر کے علمی روایت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی، لیکن منبر کی دنیا ہمیشہ اس معیار پر قائم نہ رہ سکی۔[28] عصر حاضر میں یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو چکا ہے۔ ڈیجیٹل ذرائع نے خطابت کے اثر کو وسیع کر دیا ہے، مگر اسی کے ساتھ غیر مصدقہ روایات اور اقوال کی تیز رفتار ترسیل نے دینی شعور کو خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ قرآن کا اصولِ تحقیق — ﴿فَتَبَيَّنُوا﴾ — آج پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔[29] اگر خطیب تحقیق کے بغیر روایت بیان کرے تو وہ نہ صرف علمی دیانت سے غفلت برتتا ہے بلکہ اجتماعی شعور کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس مطالعے کے مرکزی مؤقف کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ روایات سے استدلال کا صحیح منہج تین بنیادی ستونوں پر قائم ہے: سند کی صحت، متن کی درایت، اور مقاصدِ شریعت کا لحاظ۔ جب یہ اصول ملحوظ رکھے جائیں تو خطابت معاشرتی اصلاح، اعتدال اور فکری پختگی کا ذریعہ بنتی ہے؛ اور جب انہیں نظر انداز کیا جائے تو دین کی تصویر جذباتی، متنازع یا

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

غیر متوازن بن سکتی ہے۔[30] اصلاحی سطح پر ضروری ہے کہ خطیب علمی تربیت، حدیثی شعور اور اصولی فہم کو اپنی خطابت کا لازمی حصہ بنائے۔ منبر کو محض جذباتی تاثیر کا ذریعہ بنانے کے بجائے اسے فکری تعمیر اور اخلاقی تربیت کا مرکز بنایا جائے۔ روایت بیان کرتے وقت اس کا ماخذ اور درجہ واضح کیا جائے، اور اگر روایت ضعیف ہو تو سامعین کو اس کی نوعیت سے آگاہ کیا جائے۔ یہی وہ دیانت ہے جو اسلامی علمی روایت کی اصل روح ہے۔ بالآخر یہ تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ خطابت کی اصلاح دراصل روایت کے منہج کی اصلاح سے وابستہ ہے۔ جب خطیب خود کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کا امین سمجھے گا تو وہ تحقیق اور احتیاط کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ اسی دیانت اور علمی معیار کی بحالی سے خطابت ایک بار پھر معاشرتی شعور، اخلاقی توازن اور دینی بصیرت کا مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

مصادر و مراجع

1. مسلم بن الحجاج، الصحیح، کتاب الجمعۃ، حدیث 866۔
2. ابن ھشام، السیرۃ النبویۃ) بیروت: دار المعرفۃ، 1990)، 4:250۔
3. الطبري، تاریخ الرسل والملوک) بیروت: دار التراث، 1967)، 3:210۔
4. ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ) بیروت: دار الفکر، 1986)، 7:130۔
5. مسلم، مقدمۃ الصحیح، حدیث 27۔
6. ابن الجوزي، القصاص والمذکّرین) بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1983)، 89۔
7. ابن سعد، الطبقات الکبری) بیروت: دار صادر، 1968)، 6:320۔
8. القرآن الکریم، سورۃ الحشر 59:7۔
9. الخطیب البغدادي، الکفایۃ في علم الروایۃ) بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1988)، 122۔
10. مسلم بن الحجاج، مقدمۃ الصحیح، حدیث 27۔
11. الشافعي، الرسالۃ) بیروت: دار الفکر، 1979)، 20–25۔
12. ابن الجوزي، القصاص والمذکّرین) بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1983)، 102–110۔
13. ابن أبي الحدید، شرح نھج البلاغۃ) بیروت: دار إحیاء التراث العربي، 1965)، 1:358۔
14. البخاري، حدیث 107؛ مسلم، حدیث 3۔
15. النووي، المجموع شرح المھذب) بیروت: دار الفکر، 1997)، 1:63۔
16. ابن الصلاح، مقدمۃ علوم الحدیث) بیروت: دار الفکر، 1986)، 98۔
17. ابن الجوزي، الموضوعات) بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1995)، 1:45۔
18. الخطیب البغدادي، تاریخ بغداد) بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 2001)، 4:412۔
19. ابن الجوزي، الموضوعات، 2:12۔
20. النووي، الأذکار) بیروت: دار الفکر، 1994)، 8–10۔
21. الذھبي، میزان الاعتدال في نقد الرجال) بیروت: دار المعرفۃ، 1995)، 1:5۔
22. طٰہٰ عبد الرحمن، روح الدین) بیروت: المرکز الثقافي العربي، 2012)، 45۔

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 5 Issue 1 (January-March) 2025
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
March 30, 2025

23. القرآن الکریم، سورۃ النحل 16:125۔
24. القرآن الکریم، سورۃ الحجرات 49:6۔
25. الشاطبی، الموافقات فی أصول الشریعۃ (بیروت: دار المعرفۃ، 1997)، 2:8۔
26. النووي، الأذکار (بیروت: دار الفکر، 1994)، 9۔
27. مسلم بن الحجاج، مقدمۃ الصحیح، حدیث 27۔
28. ابن الجوزي، الموضوعات (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1995)، 1:50۔
29. القرآن الکریم، سورۃ الحجرات 49:6۔
30. الشاطبی، الموافقات فی أصول الشریعۃ (بیروت: دار المعرفۃ، 1997)، 2:10۔